

کشمیر کا مستقل حل

امریکہ بھارت گٹھ جوڑ

اہل پاکستان کے لیے ایک انتباہ!

پروفیسر خورشید احمد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قائد اعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہا تھا اور بھارت نے پاکستان کو بے دست و پا کرنے کے لیے آزادی کے فوراً بعد اس شہ رگ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے سازش، دھوکے، فوج کشی، بدعہدی، غرض ہر حربے اور ہتھکنڈے کا بے دریغ استعمال کیا اور بالآخر ریاست جموں و کشمیر کے دو تہائی حصے پر ناجائز اور غاصبانہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

بھارت کے اس ناجائز قبضے کو نہ صرف پاکستان اور کشمیری عوام نے کبھی تسلیم نہیں کیا بلکہ اقوام متحدہ اور عالمی برادری نے بھی قانونی، سیاسی اور اخلاقی، ہر اعتبار سے ریاست کی حیثیت (status) کو متنازعہ قرار دیا اور جموں و کشمیر کے باشندوں کے اس حق کو تسلیم کیا کہ انھیں اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے جس کے عملی اظہار کا ان کو موقع ملنا چاہیے۔

برطانوی محقق ایسٹر لیمب (Alastair Lamb) نے تو دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ قانونی طور پر بھارت سے ریاست جموں و کشمیر کا الحاق کبھی ہوا ہی نہیں تھا لیکن یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ جب بھارت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اپنا مقدمہ اس بنیاد پر لے کر گیا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر اس کا حصہ ہے جس پر پاکستان اور اس کے قبائل نے دراندازی کی ہے تو سلامتی کونسل نے ایک نہیں سات بار اس امر کا اظہار کیا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ اس کے عوام استصواب رائے کے ذریعے کریں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہے اور اقوام متحدہ کے مبصرین

لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ تقسیم ہند سے لے کر آج تک پاکستانی قوم کا متفقہ موقف یہی رہا ہے کہ کشمیر، تقسیم ہند کے نامکمل ایجنڈے کا حصہ ہے۔ تحریک پاکستان کے نظریاتی، سیاسی اور جغرافیائی ہر پہلو کا تقاضا ہے کہ وہ پاکستان کا حصہ ہو اور اسی حقیقت کا اظہار جموں و کشمیر کے معتبر نمائندوں نے جولائی ۱۹۴۷ء میں الحاق پاکستان کی قرارداد کی شکل میں کر دیا تھا۔ جس کی باقاعدہ توثیق اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے کے ذریعے کی جانی تھی جسے بھارت نے آج تک نہیں ہونے دیا۔

جہاد آزادی کی نازک صورت حال

جموں و کشمیر کے عوام اپنے اس حق کو استعمال کرنے کے لیے ۵۷ سال سے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس جہاد حریت میں پانچ لاکھ سے زیادہ کلمہ گو جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ ہزاروں عصمتیں لٹ گئی ہیں، بستیاں کی بستیاں تباہ ہو چکی ہیں، ہزاروں افراد اس وقت بھی جیلوں میں محبوس ہیں۔ لیکن جموں و کشمیر سے مسلمانوں کی والہانہ وابستگی کے جذبے اور جدوجہد میں کوئی کمزوری نہیں آئی ہے، البتہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد شملہ معاہدے کی شکل میں پاکستان نے اپنے اصولی موقف پر اصرار اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی پاسداری کے عہد کے ساتھ مسئلے کو دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے طے کرنے کی راہ قبول کرنے کی جو غلطی کی اس کا فائدہ اٹھا کر بھارت نے مسئلے کو آج تک معلق رکھا ہوا ہے اور اپنی گرفت کو مضبوط کرنے اور مقبوضہ جموں و کشمیر کو سیاسی، معاشی، عسکری ہر اعتبار سے بھارت میں ضم (integrate) کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے لیے اس نے ایک طرف جبر اور ظلم کے ہر ہتھکنڈے کا بے محابا استعمال کیا ہے تو دوسری طرف وہ پاکستان کو بار بار لایعنی مذاکرات کے جال میں پھنسانے اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ”کامیاب سیاست“ کے کرتب دکھاتا رہا ہے۔

انہی حالات سے مجبور ہو کر جموں و کشمیر کے غیور اور آزادی پسند مسلمانوں نے بھارت کے استبدادی تسلط کے خلاف سیاسی جدوجہد کو ایک نیا رخ دیا اور جہاد کا راستہ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۹ء سے پوری ریاست عملاً حالت جنگ (state of war) میں ہے اور

بھارتی اقتدار کی عملداری فوج کی بندوقوں کے سایے تک محدود ہو گئی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بھارت کی سات لاکھ فوج کے جارحانہ اقدامات کے باوجود بھارت کی سامراجی حکومت اور اس کے شریک جرم مقامی کھپلی حکمران اپنے اقتدار کو مستحکم نہیں کر سکے۔ آزاد بمصرین کی نگاہ میں اس بارے میں آج بھی کوئی دورائے نہیں کہ جموں و کشمیر کے مسلمان بھارت کی حکمرانی اور تسلط پر کسی شکل میں بھی راضی نہیں اور وہ دہلی کی حکومت سے مکمل طور پر بے تعلق (alienated) ہیں۔ یہ جموں و کشمیر کی سب سے بڑی زمینی حقیقت (ground reality) ہے جسے نظر انداز کر کے بھارت اور پاکستان کے حکمرانوں کے درمیان کشمیر کے مستقبل کے بارے میں کسی معاملہ بندی (understanding) کا تصور ہمالہ سے بھی بڑی غلطی (Himalyan blunder) کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھارت کا مشہور صحافی اور سفارت کار کلڈیپ نیر بھارت کی کشمیر پالیسی کا بڑا ہوشیار مؤید اور علم بردار ہے اور پاکستانی قیادت کو چک کے وعظ دیتا رہتا ہے لیکن وہ بھی بار بار یہ اعتراف کر چکا ہے کہ کشمیری عوام دہلی کی حکومت سے نفرت کرتے ہیں۔ بھارت کے مشہور اخبار انڈین ایکسپریس میں دفاع اور سلامتی کے امور کا ایک تجزیہ نگار اجائے شکلا (Ajai Shukla) اپنے ۵ مئی ۲۰۰۵ء کو شائع ہونے والے مضمون میں اعتراف کرتا ہے:

کشمیری دل کی گہرائیوں سے آزادی چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جسے سیاسی عزم نے اور جن لوگوں نے اس کے لیے جانیں دی ہیں ان سے وفاداری کے احساسات نے پرورش کیا ہے۔

پاکستان کے جو لبرل اور روشن خیال صحافی چند ماہ قبل کشمیر کے دورے پر گئے تھے وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ کشمیر کے عوام بھارت کے ساتھ رہنے کو کسی صورت تیار نہیں خواہ پاکستان سے الحاق کے بارے میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو اور ان میں ایک تعداد پاکستان سے اس کی پالیسیوں کے انتشار اور ژولیدہ فکری کی بنیاد پر باپوس ہو۔ ایک اور نبرل صحافی خالد حسن (ڈیلی ٹائمز کے واشنگٹن کے نمائندے) ابھی کشمیر ہو کر آئے ہیں اور وہ فرائی ڈے ٹائمز (شمارہ ۶ سے ۱۲ مئی ۲۰۰۵ء) میں لکھتے ہیں کہ:

بھارت سے علیحدگی کا احساس مکمل ہے۔ کوئی بھی کشمیری اپنے آپ کو بھارتی نہیں

سمجھتا۔ جب میں کشمیری کہتا ہوں تو میری مراد وادی کے مسلمان ہوتے ہیں۔ نہ وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں جیسا کہ کبھی پہلے چاہتے تھے۔ پاکستان نے کشمیریوں کی قیمت پر جو پالیسیاں اختیار کیں، اس سے لوگ دل برداشتہ ہیں۔ جس سے بھی بات کرو ایک ہی جواب ملتا ہے: آزادی۔ آج کے کشمیر کی حقیقت شہدا کے وہ قبرستان ہیں جہاں تقریباً تمام قبریں ان نوجوانوں کی ہیں جن کی فصل جوانی کی پہلی بہار ہی میں کاٹ دی گئی۔ (دی فرائی ڈے ٹائمز ۶-۱۲ مئی ۲۰۰۵ء)

جنرل پرویز مشرف نے اپنی دلی کی ملاقاتوں کے بعد جن توقعات کا اظہار کیا ہے اور پھر سما (South Asian Free Media Association) کے زیر اہتمام جنوبی ایشیا کی پارلیمانی کانفرنس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جس ”سنہری لمحے“ کی بات کی ہے اس کا زینی حقائق سے ڈور کا بھی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ملت اسلامیہ پاکستان اور اس کی حقیقی قیادت کے لیے سب سے بڑی ضرورت حالات کے بے لاگ جائزے اور صحیح حکمت عملی مرتب کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی ہے۔ موجودہ حکومت اپنی خوش فہمیوں کے خمار میں ایک ایسے راستے پر چل پڑی ہے جو ملک کے لیے تباہی کا راستہ ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم خدا نخواستہ ہمیشہ کے لیے اپنی شہ رگ سے محروم ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کشمیر پالیسی پر مسلسل قلابازیوں پر مبنی جنرل صاحب کے غیر ذمہ دارانہ بیانات جموں و کشمیر کی تحریک آزادی کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ بھارت سے کچھ حاصل کر سکیں گے۔ یہ ایک تاریخی مغالطہ ہے۔ دراصل پاکستان کے اصولی موقف کی قربانی اور کشمیر کی تحریک مزاحمت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر یہ حکمران کشمیری عوام کی قربانیوں سے بے وفائی ہی کے مرتکب نہیں ہو رہے بلکہ اپنے سوا کروڑ بھائیوں اور بہنوں کو دھکے دے کر بھارت کے تسلط اور امریکا کی گرفت میں دینے میں معاونت کر رہے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر پاکستان کی نظریاتی اساس پر ضرب کاری لگانے اور پاکستان کے اسٹریٹجک مفادات کو قربان کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آج پاکستان کا نظریاتی تشخص اس کی قومی سلامتی اور اس کے وسیع علاقوں کے لیے مناسب مقدار میں پانی کی فراہمی کے امکانات سب داؤ پر لگ چکے ہیں۔

ضروری ہے کہ مسئلے کے تمام ضروری پہلوؤں پر کھل کر بات کی جائے اور قوم کو بیدار کیا جائے کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے۔ اس وقت ملک کو ایک خطرناک راستے پر لے جانے کی کوشش ہو رہی ہے، اگر خدا نخواستہ یہ کامیاب ہو جاتی ہے تو دراصل یہ اقبال اور قائد اعظم کی قیادت میں برپا کی جانے والی تحریک پاکستان کی نفی اور اس جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہونے والے پاکستان کو ایک انقلاب معکوس (counter revolution) کے ذریعے دوبارہ جنوب ایشیا میں ضم کرنے پر منتج ہو سکتی ہے۔ نئے نقشہ جنگ کو سمجھنے کے لیے کشمیر پالیسی کی تبدیلی پاک بھارت دوستی کے نئے آہنگ اور جنوبی ایشیا کی نئی شیرازہ بندی کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ یہ ایک نیا سیاسی معاشی اور نظریاتی منصوبہ ہے جس میں اس علاقے کے بارے میں امریکا کی نقشہ بندی اس میں بھارت کا کردار اور اس منصوبے کو رو بہ عمل لانے میں کشمیر کی جدوجہد آزادی کی تحلیل (liquidation) علاقے کی اسلامی قوتوں کی کمر شکنی اور پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنا شامل ہے تاکہ ایک ”سیکولر پاکستان“ کا فروغ ہو جو ”سیکولرائڈیا“ کے ساتھ مل کر جنوب ایشیا کا ایک پیادہ بن جائے اور بالآخر امریکا اور بھارت کی اسٹریٹجک پارٹنرشپ (strategic partnership) کا ایک دم جھٹلا بن کر رہ سکے۔ جنرل پرویز مشرف امریکا کے جس کھیل کا ایک کردار بن گئے ہیں اس میں بات کشمیر سے چل کر بھارت دوستی اور جنوبی ایشیا کے نئے وژن تک پہنچتی ہے جو سب اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آج کشمیر پالیسی کی تبدیلی کا تعلق کشمیر سے تو ہے ہی، مگر یہ کشمیر پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ کشمیر کی تحریک آزادی کو قربانی کا بکرا بنا کر پاکستان کے اس تصور اور کردار کو ختم کرنا بھی اس کا ہدف ہے جو اقبال اور قائد اعظم کی قیادت میں ملت اسلامیہ پاک و ہند کے مسلمانوں کا تصور تھا اور پاکستان کا قیام جس منزل مقصود کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس لیے کشمیر پالیسی کی تبدیلیوں اور اس کے مضمرات پر بات کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ بھارت اور خود امریکا کا اصل ہدف سامنے رہے تاکہ جنرل صاحب کی کشمیر پالیسی کے خطرناک رخ کا صحیح ادراک ہو سکے۔

بھارتی حکمت عملی اور صدر مشرف

کلدیپ نیر نے دہلی مذاکرات اور پاکستان کی کشمیر پالیسی کی تبدیلی پر کھل کر جو کچھ لکھا

ہے اسے قوم کے سامنے لانا بہت ضروری ہے۔ ڈان کے ۱۶ اپریل اور ۲۶ اپریل ۲۰۰۵ء کے شماروں میں کشمیر کے مسئلے پر موصوف کے دو مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور بین الاقوامی بساط پر کھیلے جانے والے کھیل کے خدوخال کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۶ اپریل کو No Halfway Stop for Musharaf کے عنوان سے چودھری شجاعت حسین کے جامع مسجد دہلی کے خطاب کے پس منظر میں پاک بھارت دوستی کے اصل اہداف کو نمایاں کرتے ہوئے موصوف کا ارشاد ہے کہ پاکستان کا اصل تصور جوان کی نگاہ میں قائد اعظم کا تصور تھا۔ اسلامی نظام نہیں سیکولرزم تھا۔

He wanted it to be a secular polity not mixing religion with politics. He died an unhappy man because during his lifetime he saw the country being mutilated and deformed in the name of Islam.

وہ چاہتے تھے کہ یہ ایک سیکولر معاشرہ ہو جس میں مذہب کو سیاست سے نہ ملایا جائے۔ وہ اپنی موت کے وقت ایک ناخوش انسان تھے اس لیے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے ملک کو اسلام کے نام پر مسخ اور بدہیت ہوتے دیکھا۔

شکر ہے کہ گلڈ پیپ نیر صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ اسلام کے اس ”تخریبی عمل“ کا اظہار قائد اعظم کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا ورنہ ہمارا لبرل طبقہ تو سارا الزام جنرل ضیاء الحق کے دور کو دیتا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

پاکستان میں کیوں ایسا جمہوری نظام قائم نہیں ہو سکتا جیسا کہ بھارت میں ہے۔

پھر کھل کر ارشاد ہوتا ہے کہ:

ان کو جان لینا چاہیے کہ وادی صرف اس لیے پاکستان کو نہیں مل سکتی کہ یہ مسلم اکثریتی علاقہ ہے۔ دو قومی نظریہ اب صرف تاریخ ہے۔ جناح مذہب کو سیاست سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ صدر مشرف وادی میں جناح کی منطق کا اطلاق نہ کر کے آدھے رستے میں رک گئے۔ درحقیقت اسلام آباد نے کشمیریوں کی مقامی جدوجہد کو

اخلاقی و سفارتی حمایت کے نام پر اسلامی قرار دے کر اس کو بہت نقصان پہنچایا۔
موصوف اس کے بعد اس بھارتی ضد کا اعادہ کرتے ہیں کہ کشمیر کو پاک بھارت دوستی
کے مذاکرات میں اولیت کا مقام نہیں دیا جاسکتا۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ بھارت اور پاکستان کے تعلقات کشمیر کا یرغمال
کیوں ہوں؟ اگر کشمیر سے ان کا تعلق توڑ دیا جائے تو حل تک پہنچنا آسان ہوگا۔
جب ۱۰ سابق پاکستانی سفارت کاروں نے بھارت کا دورہ کیا اور بھارتی سفارت
کاروں کے سامنے کشمیر کی مرکزیت پر اصرار کیا تو کلڈیپ نیر صاحب اس پر برا فروختہ ہوئے
اور فتویٰ دے دیا کہ:

پاکستان کے سابق سفرانے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا کیونکہ انھیں کشمیر کا خط تھا۔ وہ کہتے
یہی تھے کہ سارے مسائل کا حل صرف کشمیر کے مسئلے کے حل پر مبنی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ سفارت کار پاکستان کے اصولی موقف کی موثر ترجمانی کر رہے
تھے مگر کلڈیپ نیر صاحب بھارت کے موقف پر انھیں لانا چاہتے تھے اور سرحدوں کو غیر موثر
بنانے کو مسئلے کا حل قرار دے رہے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اصل حل یہ ہے کہ سرحدوں کو نرم ہونا چاہیے تاکہ انھیں پار کرنا ایسا ہو جائے جیسے ایک
گلی سے دوسری گلی میں جانا۔ ”شجاعتوں“ اور ”مشاہدوں“ کو اس مقصد کے لیے کام
کرنا چاہیے نہ کہ اس طرف یا اس طرف مسلمانوں کے علاقوں کے نقشے بنانا۔
دہلی میں مشرف موہن سنگھ مذاکرات کے بعد جو ”روشنی“ ان کو نظر آئی ہے اور جو پسپائی
پاکستان کے موقف میں رونما ہوئی ہے اس کا ادراک بھی کلڈیپ نیر ہی کے الفاظ میں ضروری
ہے جسے وہ عالم انبساط میں بالآخر ہری جھنڈی (Green Light Finally) کے عنوان سے
۱۶ اپریل کی اشاعت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کا اظہار جس زبان میں کرتے
ہیں اس میں ان کی خوشی ہی پھوٹی نہیں پڑتی بلکہ پاکستان کی بے بسی اور بے حسی دونوں کی تصویر
بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

صدر مشرف کے دہلی کے دورے کے کئی دن گزرنے کے بعد بھی یہاں یہ بحث گرم
ہے کہ کیا وہ تبدیل ہو گئے ہیں؟ اور ہو گئے ہیں تو کیوں۔

میں نے سابق وزیراعظم اندر گجرال سے پوچھا کہ کیا مشرف بدل گیا ہے؟ گجرال نے جواب دیا: اس کے پاس کیا راستے ہیں؟ اس کے ملک کو اُن گنت مسائل کا سامنا ہے۔ اسے دکھ رہا ہے کہ بھارت بڑے سے بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے امریکی دوستوں نے اسے بتا دیا ہے کہ کشتی کو نہ ڈبوئے۔ (وزیر خارجہ نوزنگھ نے مشرف کی دہلی میں آمد سے دو روز قبل اپنے واشنگٹن کے دورے میں اس بات کو محسوس کر لیا تھا)۔

بھارتی ایڈیٹروں سے ملاقات میں مشرف نے پہلے تو ہنستے ہوئے کہا کہ وہ ایک نئے دل کے ساتھ آئے ہیں (مطلب تھا کہ آگرہ کی ناکام سربراہی کانفرنس کے بعد)۔ پھر انھوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا کہ امریکا میں نائن ایون کے حملوں نے انھیں تبدیل کر دیا ہے۔ ظاہر تھا کہ امریکا نے اسے واضح الفاظ میں (in no uncertain terms) بتا دیا تھا کہ واشنگٹن سرحد پار دہشت گردی کو سنجیدگی سے لے گا (take serious note)۔

مشرف نے من موہن سنگھ کو جو یقین دہانی کروائی تھی، اسے دہرایا کہ دہشت گردوں کو امن کے عمل کو ناکام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ وہ جنگجوؤں کو پاکستان کا کوئی علاقہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ (کہا جاتا ہے کہ اسلام آباد نے اس بارے میں دہلی کو تحریر بھی دی ہے)

اس امر کی کافی شہادت ہے کہ دہلی کے بارے میں اسلام آباد کی پالیسی تبدیل ہو گئی ہے۔ کشمیر اعتماد سازی کے اقدامات میں سے ایک قدم ہو گیا ہے، نہ کہ مرکزی مسئلہ (core issue) یا ایجنڈے کی پہلی شق۔ پاکستان نے بھارت کی اس یقین دہانی کو بھی تسلیم کر لیا ہے کہ وہ کسی مرحلے پر کشمیریوں کو بھی یقیناً آخری فیصلے سے قبل مذاکرات میں شریک کرے گا۔

مشرف یقین رکھتا ہے کہ اگر سرحدیں اور لائن آف کنٹرول تبدیل نہیں کی جاسکتیں، تو سرحدوں کو نرم اور غیر متعلق بنانا (جیسا کہ وہ اسے کہتے ہیں) بہتر ہے۔

کلڈیپ نیئر کی یہ تحریر ہزار تقریروں اور بیانات پر بھاری ہے اور بھارت اور پاکستان

دونوں کی کشمیر پالیسی کے بارے میں تازہ ترین صورت حال کی عکاس ہے۔
 اقبال نے شاید کسی ایسی ہی صورت حال کے بارے میں کہا ہوگا کہ۔
 دیکھ مسجد میں شکستِ رشتہ تسخیرِ شیخ
 بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

مشرف ہمارا بہترین ساتھی

جنرل پرویز مشرف کی کشمیر پالیسی کی حالیہ تبدیلی، پاک بھارت دوستی اور بھارت کی ثقافتی یلغار اور سیکولر نظام کے فروغ کی باتوں میں کلدیپ نیر تنہا نہیں ہر طرف سے یہی آواز اٹھ رہی ہے۔ عین اس زمانے میں غالباً بھارت کی تاریخ میں پہلی بار قائد اعظم کی دریافت نو (rediscovery) کا ایک شراکتیز سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ قائد اعظم پر ایک بھارتی دانش ور پروفیسر آسیانیندا (Asiananda) کی ایک کتاب *Jinnah - A Corrective Reading of Indian History* شائع ہوئی ہے۔ اس کی تقریب رونمائی اپریل ۲۰۰۵ء کے وسط میں جنرل پرویز مشرف کی دہلی یاترا سے دو دن پہلے بھارت کے وزیر دفاع پرناب مکرجی اور وزیر پٹرولیم مانی شنکر آرگر کی موجودگی اور سرپرستی میں منعقد ہوئی تھی۔ کتاب کا مرکزی خیال ہے کہ محمد علی جناح اسی درجے کے ایک "great secular" لیڈر تھے جیسے پنڈت نہرو (دی ہندو) ۱۵ اپریل ۲۰۰۵ء)

بھارت کے ایک اور دانش ور رفیق دوسانی کی تازہ ترین کتاب: *Prospects for Peace in South Asia* حال ہی میں امریکا سے شائع ہوئی ہے اور یہ صرف انھی کی نہیں بلکہ بھارت اور امریکا کے دانشوروں کی مشترک سوچ کا حاصل ہے۔ دوسانی خود بھی امریکا کی مشہور اسٹیفو رڈیونی ورٹی سے وابستہ ہیں اور اس کتاب میں ان کے علاوہ امریکا کے کلیدی ادارے ووڈرو ولسن سنٹر کے ڈائریکٹر رابرٹ ہتاوے اور ایک دوسرے پالیسی ساز ادارے اسٹیمسن سنٹر کے پروفیسر مائیکل کریپن سب کا تجزیہ شامل ہے۔ ان کی نگاہ میں مسئلہ کشمیر کی وجہ سے حسب ذیل رجحانات پروان چڑھے ہیں۔ ○ علاقے میں مذہب کے کردار کا فروغ (اسے وہ مذہبی انتہا پسندی کہتے ہیں) ○ بھارت اور پاکستان کے نیوکلیئر طاقت بننے کا عزم داعیہ اور

سانحہ ○ پاکستان کی آرمی کا سیاست میں کود جانا ○ قومی شناخت کی مرکزیت۔

اس کتاب میں بھارت کے عالمی عزائم اور اس کے لیے پاکستان سے کسی نہ کسی شکل میں معاملات طے کرنے کی ضرورت اور دوسری طرف پاکستان کی اس مجبوری کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ بھارت کی بڑھتی ہوئی فوجی سیاسی اور معاشی قوت کی وجہ سے بہر حال پاکستان کو بھی کہیں نہ کہیں سمجھوتا کرنا ہے اور ان کی نگاہ میں اس کے لیے سب سے مناسب وقت یہی ہے۔ لیکن اس کتاب کا بھی ٹیپ کا بند یہی ہے کہ جنرل مشرف اس کام کو انجام دینے کے لیے بہترین شخص ہیں اور یہ اس لیے کہ وہ اور جنرل جہانگیر کرامت دونوں ایک ”سیکولر پاکستان“ کے علم بردار ہیں۔

ہماری نگاہ میں اس منظر نامے کی سب سے مؤثر ترجمانی بھارت کے ایک اور دانش ور سو با چندرن نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مگر نہایت کھلے انداز میں کی ہے۔ موصوف بھی اس وقت امریکا کے علمی اور پالیسی ساز حلقوں ہی میں سرگرم ہیں اور دہلی کے Institute of Peace and Conflict سے وابستہ ہیں۔ ان کے ارشادات بڑے گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں اور کشمیر کے بارے میں امریکا اور بھارت کی حکمت عملی کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ واشنگٹن میں ان کا ارشاد ہے کہ اس وقت بھارت کے اصل اہداف یہ ہیں:

(ا) امن کی بات چیت کے عمل کو بہر صورت برقرار رکھا جائے۔

(ب) کشمیر کے بارے میں یہ سمجھوتا کہ سرحد پار دہشت گردی حد سے نیچے رہے خواہ مکمل طور پر ختم نہ بھی ہو۔

(ج) مستحکم اور سیکولر پاکستان۔

موصوف کانٹے کی بات یوں کہتے ہیں:

اگر جنرل مشرف ان تین عنوانات سے بھارت کے مطالبے کو پورا کر سکیں، تو ان سے معاملہ کرنا بھارت کے مفاد میں ہوگا۔ بھارت کو جو مسئلہ طے کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی اور فوجی صورت حال میں کیا وہ بہترین رفیق کار ہیں۔

اور ان کا مشورہ یہی ہے کہ:

ہوسکتا ہے کہ جنرل مشرف صحیح آدمی نہ ہوں، لیکن وہ پاکستان میں بھارت کے

بہترین سا جھی ہیں۔ وہ قابلِ اعتماد ہوں یا نہ ہوں، نتائج صرف وہی دے سکتے ہیں۔

پروفیسر سو با چندرن ان وجوہ کی طرف بھی واضح اشارہ کر دیتا ہے جن کی وجہ سے وہ بھارت کے منصوبے کے لیے جنرل پرویز مشرف کو بہترین سا جھی سمجھتا ہے۔

بھارت نے آج تک کسی متبادل (option) کی بات نہیں کی۔ وہ اٹوٹ انگ اور ناقابلِ تغیر سرحد کی بات کرتا ہے مگر جنرل صاحب کا ذہن کیا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اتنے حل پیش کیے ہیں کہ اب اس میں کوئی شک نہیں وہ کسی نہ کسی سمجھوتے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے موقف سے اتنا ہٹ گئے ہیں کہ مزید سمجھوتوں کی انھی سے توقع ہے۔ نیز جو بھارت کا اصل مقصد اور فوری ہدف ہے، یعنی کشمیر میں تحریک مزاحمت ختم ہو جائے یا کمزور ہو جائے اور منقسم رہے وہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ جہادی تحریک دم توڑ دے۔ یہاں بھی موصوف کی نگاہ میں جنرل صاحب کا کردار ہی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ سو با چندرن کہتے ہیں:

وہ واحد آدمی ہیں جو سرحد پار دہشت گردی کو کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ بھارت کے مفاد میں ہوگا کہ مسلح جدوجہد قابلِ برداشت حد سے نیچے رہے، تاکہ نئی دہلی اور سری نگر کے درمیان کسی عمل کا آغاز ہو سکے اور لائن آف کنٹرول پر باڑ لگانے کے کام کو مکمل کیا جاسکے۔

موصوف کی نگاہ میں جنرل پرویز مشرف ہی وہ شخصیت ہیں جو اس مفت آسمان کو سر کیے جانے کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اصل ہدف سری نگر اور مظفر آباد میں راہداری نہیں، لائن آف کنٹرول پر اپنی گرفت مضبوط کر کے سنٹر کو آسان بنا ہے جیسا کہ بی بی سی نے کہا کہ ایک گلی سے دوسری گلی میں جا سکیں، لیکن اصل مقصد سری نگر اور دہلی کے رشتوں کو مضبوط کرنا ہے تاکہ کشمیر بدستور بھارت کے نقشے کے مطابق ہی رہے۔

پھر سب سے اہم اسٹریٹجک ہدف یہ ہے کہ پاکستان کی فوج اس معاملے میں اس طرح ملوث ہو کہ بھارت کے اہداف حاصل ہو سکیں اور پاکستانی عوام بھی کوئی منفی تحریک نہ اٹھا

سکیں اور جو بات یا جو صل بھی امریکا، بھارت اور جنرل صاحب طے کر لیں، اسے ملک کے عوام پر مسلط کیا جاسکے۔ سو باچنדרن اپنے تجزیے میں صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ:

پاکستان میں سیاسی قیادت کمزور ہے اور مستقبل قریب میں بھی ایسی ہی رہے گی۔ دو طرفہ سطح پر جو کچھ طے کیا گیا ہے، صرف مشرف وہ فرد ہیں، جو اسے نافذ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بہت اکثریت حاصل کرنے کے باوجود نواز شریف لاہور پروس کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اگر یہ ایک حقیقت ہے، تو فوج سے براہ راست معاملہ طے کرنا بھارت کے مفاد میں ہے۔ اگر مشرف آج اسے کنٹرول کرتے ہیں تو بھارت کو ان سے معاملہ کرنا چاہیے۔ جنرل میں اتنا حوصلہ تھا کہ اس نے تسلیم کیا کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں اب غیر متعلق ہو گئی ہیں۔ اور ایک نرم سرحد کو عارضی حل سمجھا جاسکتا ہے۔

اور ٹیپ کا بند بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ جنرل صاحب خواہ ویسے بھارت کو پسند نہ ہوں لیکن اس لیے ضرور پسند ہیں کہ:

حقیقت یہ ہے کہ صرف جنرل مشرف ہی بھارت سے کیے گئے سمجھوتے کو پاکستان میں زبردستی نافذ (impose) کر سکتے ہیں۔

اس جملے کا ایک ایک لفظ اہم ہے۔ جنرل صاحب ایک ”ناگزیر برائی“ ہیں لیکن مطلب براری کے لیے ضروری ہیں۔ جو بات بھارت سے طے ہو وہ پاکستان کے عوام کے وژن، تصورات، احساسات اور مفادات کے خلاف ہوگی اور اسے ملک پر مسلط (impose) کرنا ضروری ہوگا اور یہ جنرل صاحب اور فوج کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس لیے جنرل صاحب امریکا اور بھارت دونوں کے لیے بہترین مہرے ہیں یا کھل کر بات کی جائے تو تروپ کا پتہ ہیں! اور یہی وہ مجوزہ کردار ہے جس کے لیے ان کی وردی بھی ضروری ہے۔ امریکا اور بھارت کی جمہوریت نوازی اپنی جگہ، لیکن اس سیاسی نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے جس کردار کی ضرورت ہے، اُسے فوجی لباس ہی میں ہونا چاہیے اور فوج کی قیادت بھی اسی کے پاس ضروری ہے، اور اسے اس روشن خیال اعتدال پسندی کا علم بردار ہونا چاہیے جو دراصل سیکولرزم کا دوسرا عنوان ہے اور جس کا اصل ہدف پاکستان کو اسلامی تشخص، اور جہاد فی سبیل اللہ سے محروم کرنا ہے۔

امریکا بھارت ملی بھگت

کشمیر کے سلسلے میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اسے اس علاقے کے بارے میں امریکا کے عزائم اور امریکا بھارت اور اسرائیل کی اسٹریٹجک پارٹنرشپ اور خود اقوام متحدہ کی ساخت نو (restructuring) کے پس منظر سے الگ کر کے نہیں سمجھا جاسکتا۔ اگر آپ امریکا کے سابق وزیر خارجہ سٹروب ٹالبوٹ کی کتاب *Engaging India* کا بغور مطالعہ کریں اور خصوصیت سے کارگل کے واقعے کے سلسلے میں اور پھر اس کے نتیجے میں بھارت اور امریکا میں جو فکری اور سیاسی ہم آہنگی ہی نہیں بلکہ اعتماد باہمی اور مفادات کا اشتراک رونما ہوا اس نے اس اسٹریٹجک پارٹنرشپ کی راہ ہموار کی جو اب جارج بوش کے دور میں ایک حقیقت بن چکی ہے۔ جسوت سنگھ نے ٹالبوٹ اور کلنٹن کے کردار اور تعاون کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ امریکا کے اس کھیل پر مہر تصدیق ثبت کر دی جو وہ پاکستان اور بھارت کے تنازع کا فائدہ اٹھا کر بھارت سے دوستی اور نئی پارٹنرشپ کے حصول کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جسوت سنگھ کا بیان غور کرنے کے لائق ہے:

ہمارے اور ہمارے پڑوسیوں کے درمیان گذشتہ چند مہینوں میں کچھ خوفناک باتیں ہو چکی ہیں۔ لیکن اس اختتام ہفتہ میرے اور آپ کے ممالک کے درمیان کچھ نئی اور بہت اچھی چیزیں واقع ہوئی ہیں جو بھروسے اور اعتماد سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں اور میرے وزیر اعظم اس کے لیے آپ کے صدر کے شکر گزار ہیں۔

اب یہی وہ اسٹریٹجک پارٹنرشپ ہے جو مسئلہ کشمیر کو تحلیل (liquidate) کرنے، سرحدوں کو غیر موثر بنانے، تحریک جہاد کو ختم کرنے اور پاکستان اور بھارت کو نئے سیاسی معاشی ثقافتی رشتوں میں جکڑنے کے ایک نئے قسم کے "اکھنڈ بھارت" کے احیا کے لیے سرگرم عمل ہے اور اس کا اصل اور آخری ہدف اسلامی احیا کے راستے کو روکنا ہے۔ دیکھیے ہنری کسنجر کس چابک دستی سے اس مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنے ایک تازہ مضمون *Implementing Bush's Vision* میں وہ یوں رقم طراز ہے:

"Now India, in effect a strategic partner, not because of compatible domestic structures but because of

parallel security interests in South East Asia and the Indian ocean and vis-a-vis the radical Islam" (The Nation May 17th, 2005).

اب بھارت اسٹریٹجک پارٹنر ہے، ایک جیسے داخلی نظام کی بنا پر نہیں، بلکہ جنوبی مشرقی ایشیا اور بحر ہند میں انقلابی اسلام کے مقابلے میں سلامتی کے متوازی مفادات کے حصول کے لیے۔

سیاست کا نقشہ اب بالکل واضح ہے۔ امریکا اور بھارت کے تعاون کا مقصد چین کے خلاف محاذ آرائی ہی نہیں، بلکہ بھارت کو ایک علاقائی قوت سے بڑھ کر ایک عالمی قوت بنانا ہے جس کے بارے میں گذشتہ ایک سال میں ایک درجن سے زائد امریکی رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں اور تازہ ترین رپورٹ مئی کے دوسرے ہفتے میں شائع ہونے والی کارنیگی انڈوومنٹ کی رپورٹ ہے یعنی South Asian Seesaw: A New US Policy on the Subcontinent جسے اس ادارے کے ایک سینیئر اسکالر ایشلے جے ٹیلنگ نے مرتب کیا ہے اور جو اپنی رپورٹ کو امریکی وزیر خارجہ کوئڈ و لیزارٹس کے افکار کا پرتو قرار دیتا ہے۔ اس رپورٹ میں اس بات کا بھی صاف اعتراف ہے کہ امریکا کی طرف سے پاکستان کو ایف-۱۶ اطمینانوں کی پیش کش پر بھارت کی طرف سے جو بس واجبی سی تنقید کی گئی ہے وہ اسکیم کا حصہ اور امریکی بھارت ملی بھگت ہے جو نئی امریکی حکمت عملی کا نتیجہ ہے:

علاقے کی تشکیل کے لیے امریکا کی غیر علانیہ نئی حکمت عملی کا نتیجہ: ایک عالمی قوت (global power) کے طور پر بھارت کو آگے بڑھانا، جب کہ پاکستان کو بھی ایک کامیاب ریاست ہونے کے لیے مدد پہنچانا ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے بھارت کی توانائی کی ضرورتوں کو پورا کرنا، اسے ایک عسکری قوت بنانا اور اسے ایک نیوکلیئر قوت کی حیثیت سے عالمی نظام کا حصہ بنانا اس حکمت عملی کا حصہ ہے۔ گویا بھارت ایک عالمی طاقت ہوگا اور پاکستان اس کی ایک باج گزار اور طفیلی ریاست!

قومی کشمیر پالیسی سے انحراف

جزل مشرف کہتے ہیں کہ وہ اہل کشمیر کے مفادات سے بے وفائی کے مرتکب نہیں

ہوئے مگر صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل کھوکھلا اور خلاف حقیقت ہے۔ جو کچھ وہ عملاً کر رہے ہیں وہ امریکا اور بھارت کی حکمت عملی کے فریم ورک کے بالکل مطابق ہے۔

ذرا ذہن میں تازہ کر لیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں کیا کیا ہے:

۱- روشن خیال اعتدال پسندی کے نام پر پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ کہا ہے کہ سیکولرزم اسلام سے متصادم نہیں اور پاکستان کو اپنے سیکولر ایج کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنا چاہیے۔

۲- امریکا کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں اس طرح شرکت کی ہے کہ امریکا سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ امریکا کے جتنے سپاہی افغانستان میں ہلاک ہوئے ہیں ان سے زیادہ پاکستان کے فوجی خود پاکستان کی سرزمین پر ایسے لوگوں کے تعاقب میں مارے گئے ہیں جو امریکا کو جتنے بھی مطلوب ہوں لیکن وہ پاکستان کے لیے کبھی خطرہ نہ تھے اور اگر آج وہ جنرل مشرف کے مخالف ہو گئے ہیں تو محض اس لیے کہ جنرل صاحب محض امریکا کی محبت میں ان کے خون کے پیاسے ہیں اور انھوں نے اپنی فوج کو ان کے خلاف اعلان جنگ کر کے انھیں آگ اور خون کی ہولی میں دھکیل دیا ہے۔ ناردرن ایریا کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل صفدر حسن کے بقول (دی ڈیلی ٹائمز، ۲۳ مئی ۲۰۰۵ء) شمالی علاقہ جات میں ۷۰ ہزار پاکستانی فوجی ۶۶۹ چوکیوں پر سرگرم ہیں جو اب تک ۲۸ آپریشن کر چکے ہیں جن میں ۳۰۶ افراد مارے گئے ہیں بشمول ۱۵۰ غیر ملکی؛ جب کہ خود پاکستانی فوج کے ۲۵۱ جوان اور افسر ہلاک ہو چکے ہیں اور ۵۵۰ زخمی ہوئے ہیں۔ یہ تعداد ساڑھے تین سال میں افغانستان میں مرنے اور زخمی ہونے والے امریکی فوجیوں سے زیادہ ہے۔ کیا ملک میں کوئی فرد یا ادارہ ایسا نہیں جو احتساب کرے اور پوچھے کہ کس کی جنگ کون لڑ رہا ہے اور کس قیمت پر؟

۳- کشمیر جس کے بارے میں فروری ۲۰۰۲ء تک کہا جا رہا تھا کہ یہ ہماری خارجہ پالیسی اور پاک بھارت تعلقات کے باب میں مرکزی ایٹو (core issue) ہے اور اس مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق جموں و کشمیر کے عوام کی آزاد مرضی سے حل کیے بغیر بھارت سے کوئی سیاسی یا تجارتی معاملہ نہیں کیا جاسکتا اور کشمیر کی تحریک جہاد آزادی کی جنگ ہے جسے کسی اعتبار سے دہشت گردی قرار نہیں دیا جاسکتا، ایک ایک کر کے ان سب پر موقوف کو تبدیل کر لیا

گیا۔ بھارت کی cross-border infiltration اور cross-border terrorism کی زبان ہم بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ بھارت کے ساتھ دہشت گردی کے پروٹوکول پر دستخط کر دیے گئے اور پاک بھارت مذاکرات کو نہ صرف بھارتی مطالبے کے مطابق اس نام نہاد دہشت گردی کے خاتمے سے مشروط کر دیا گیا ہے جس کا اعادہ بھارتی قیادت دن رات کر رہی ہے اور کشمیر کے اپنے اٹوٹ انگ ہونے کے دعوے کے ساتھ کر رہی ہے بلکہ بھارت کے دوستی کے عمل میں پیش رفت کو کشمیر کے مسئلے کے حل سے بے تعلق (delink) بھی کر دیا گیا۔ نیز اقوام متحدہ کی قراردادوں کو بھی ہم نے اٹھا کر رکھ دیا۔ متبادل حل کے طور پر تقسیم کشمیر کی تجویز پر بھی غور ہونے لگا اور وہ بھی مشترک کنٹرول اور محدود خود مختاری کی باتوں کے ساتھ۔ اب اصل مسئلہ ہی بدل گیا ہے بھارت کے ناجائز قبضے سے جموں و کشمیر کی نجات اور جموں و کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کا مطالبہ جو ازل دن سے پاکستان کا اصول اور قومی موقف تھا اور ہے اور جسے دستور کی دفعہ ۲۵ میں ملک و قوم کا وہ موقف قرار دیا گیا ہے جس پر کوئی فرد سمجھوتا کرنے کا مجاز نہیں اب اس کا ذکر غائب ہے اور بات صرف نرم سرحدوں (soft border) اور سرحدات کو غیر متعلق بنانے (making borders irrelevant) کی ہو رہی ہے جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ امریکا اور بھارت کے مجوزہ ”حل“ پر سمجھوتا کر لیا جائے جس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

(ا) کشمیر کی مستقل تقسیم

(ب) دونوں حصوں میں کسی خاص شکل کی ”خود مختاری“

(ج) بھارت کے عمل دخل اور دراندازی کے لیے مستقل گنجائش

(د) امریکا کے لیے علاقے میں داخلے کی کھڑکی کھولنا۔

اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کشمیر کی تحریک آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے یا وہاں کی قیادت کو اس نئے نظام کا حصہ بنا لیا جائے یا پھر ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر بھارتی فوج کے ہاتھوں ختم ہو جانے یا مجبوری کے عالم میں غلامی کی کسی نئی شکل پر آمادہ ہو جانے کا سامان کیا جائے۔

آپ سات متبادلات (seven options) کا جائزہ لیں یا تیسرے حل (third

(option) کی بات کریں، یا امریکی اسٹڈی گروپ اور فاروق کٹھواری جیسے لوگوں کی پیش کردہ اسکیموں کو دیکھیں، سب کا مرکزی خیال یہی ہے اور اب جنرل صاحب جو نقطہ نظر پیش فرما رہے ہیں وہ اس امر کی بھارتی ایجنڈے سے مختلف کوئی چیز نہیں۔ بھارتی اخبار دی ہندو کے نائب مدیر سدھارتھ وراڈا راجن نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں جنرل مشرف اور من موہن سنگھ کی دلی ملاقات کے بعد حالات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں اپنے اصولی موقف سے پاکستان کی پسپائی اور بھارت کے اپنے ایجنڈے کے مطابق معاملات کو آگے بڑھانے کی پوری تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو، 'Slaying the Demons of Distrust' نیوز لائن، مئی ۲۰۰۵ء)

اور جس اعتماد (trust) پر اب سارا کاروبار مملکت چلانے اور بھارت سے کشمیر سمیت سارے معاملات طے کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں اس کا حاصل تو صرف یہ نظر آ رہا ہے کہ مقصد اور ترجیح بھارت کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ پاکستان کے اہداف، مقاصد اور مفادات، پاکستانی عوام کی تمنائیں اور عزائم اور سب سے بڑھ کر انصاف اور عدل کے تقاضے، کشمیر کے ڈیڑھ کروڑ انسانوں کے حقوق اور ان کی آزادی سب ثانوی بلکہ غیر متعلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ دیکھیے بھارت کے اخبار انڈین ایکسپریس نے اپنی ایک تازہ اشاعت میں اس صورت حال کو کس طرح پیش کیا ہے:

"Now that the April Foreign Policy euphoria is over, the party poopers are out with full force. The question is again being asked : Can we trust Gen Musharraf?"

اب، جب کہ خارجہ پالیسی کا اپریل کا سرخوشی کا عالم گزر چکا ہے، پارٹی کے ڈھنڈورچی پوری طاقت سے میدان میں آگئے ہیں، یہ سوال پھر پوچھا جا رہا ہے: کیا ہم جنرل مشرف پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟

یہ سوال اٹھانا ظاہر کرتا ہے کہ ہم نے واقعتاً کوئی چیز دی ہے۔ لیکن سادہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قطعاً کوئی رعایت نہیں دی۔ سرحد کے ردوبدل، کشمیر میں سی بی ایم کی ترجیح، سب پر ہماری پوزیشن پہلے جیسی ہے۔ اس وقت تو ہم سے زیادہ پاکستان کو

ایڈجسٹمنٹ کرنا ہے۔

اس کے بعد موصوف کہتے ہیں کہ بھارت کے لیے سلامتی اوّلین اہمیت کی حامل ہے اور اس پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ نیز پاکستان پر امریکی دباؤ شدید ہیں اور وہ پاکستان کو یہ بھی خوف دلاتے ہیں کہ زمینی حالات بدل گئے ہیں اور اب کشمیر میں پاکستان کی تائید بہت کم ہے لکھتے ہیں:

کشمیر کے اندر پاکستان کی حمایت اپنی زیریں ترین سطح پر ہے۔ پاکستان پر امریکی دباؤ بھی اپنی کاٹ دکھا رہا ہے اس لیے کہ ان کا دہشت گردی کے بارے میں تصور تبدیل ہو چکا ہے۔ (دی نیشنن، ۱۷ مئی ۲۰۰۵ء)

ان تمام امور کے ساتھ اس بات پر بھی غور کریں کہ جنرل صاحب نے تازہ ترین دعویٰ یہ بھی کر دیا ہے کہ:

میرا خیال ہے کہ حل موجود ہے۔ مجھے اس پر یقین ہے اور میں وہ حل جانتا ہوں کہ جو بھارت، پاکستان اور کشمیری عوام کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے۔ (ڈان، ۲۱ مئی ۲۰۰۵ء)

اس میں وہ بھارت کی ”سیکولر حساسیت“ (secular sensitivity) کے آگے بھی سپر ڈالتے نظر آ رہے ہیں اور دو قومی نظریہ، حق خود ارادیت اور حاکمیت کے تمام اصولوں کو ترک کر کے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ:

اس لیے ضروری ہے کہ یہ عوام کی بنیاد پر علاقے کی بنیاد پر ہو۔ علاقہ متعین کیا جائے لوگوں کو سیلف گورنس دی جائے، غیر فوجی علاقہ بنایا جائے اور کچھ ایسے کام کریں کہ سرحدوں کا سوال غیر متعلق ہو جائے۔

اس پوری تقریر میں زیادہ سے زیادہ اپنی حکمرانی (maximum self governance) اور سرحدوں کو غیر متعلق بنانا کلیدی تصورات ہیں جن کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب آزادی اور حق خود ارادیت کا مسئلہ تو باقی ہی نہیں رہا۔ بھارت جو چاہتا تھا کہ جموں و کشمیر کے علاقے دونوں ملکوں کے زیر اثر رہیں، ان کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے دی جائے (جو خود بڑا دھندلا تصور ہے اور جس کا تجربہ مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کے زمانے میں ہو چکا

ہے) اور یہ اضافہ کر دیا جائے کشمیر کے تمام حصوں کے درمیان سرحد غیر متعلق ہو جائے۔ سرحد محض ایک سرحدی لکیر کا نام نہیں، یہ کسی ملک یا علاقے کی حاکمیت کی علامت ہے۔ اور اگر یہی غیر متعلق ہو جائے تو پھر سیاسی آزادی اور علاقائی سلامتی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

واضح رہے کہ من موہن سنگھ نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف لینے کے بعد جو پہلی بات کی، وہ نرم سرحدوں کی تھی۔ اسی بات کو اب جنرل صاحب دہرا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ دہلی میں ان کے اس ارشاد کو بھی شامل کر لیجئے کہ کشمیر کے مستقبل کے نظام میں حریت کانفرنس کی قیادت کے ساتھ عمر عبداللہ اور محبوبہ مفتی کا بھی کردار ہوگا۔ اور شاید اس نہلے پر دہلا لگاتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ پانی کے مسائل کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ بنگلہ دیش اور کشن گنگا کے ڈیم وغیرہ کے سلسلے میں مشترک نگرانی کا نظام قائم کیا جائے۔

اس سارے معاملے کا ایک اور تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ متبادل حلوں کے اس سارے کھیل نے خود کشمیری قیادت کو بانٹ دیا ہے اور ان کے درمیان شدید کنفیوژن کی کیفیت ہے۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس منقسم ہے اور اب ایک طرف میر واعظ عمر فاروق اور عمر عبداللہ (نیشنل کانفرنس) کے ساتھ ایک محاذ پر جمع ہونے کی باتیں کر رہے ہیں تو دوسری طرف سردار عبدالقیوم اپنی تاریخی پوزیشن تبدیل کر کے سات حلوں کے گن گانے لگے ہیں اور کشمیریوں کو ”کسی بھی قسم کی خود مختاری“ مل جانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ البتہ مجاہدین اور وہ کشمیری لیڈر جو اپنی اصولی پوزیشن پر مردانہ وار ثابت قدم ہے اور ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہے، سید علی شاہ گیلانی ہے جو پاکستان کا سب سے مضبوط قلعہ ہے لیکن وہ اب یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ ”ہم نہ تھکے ہیں اور نہ دبے ہیں لیکن پاکستان کی قیادت غالباً تھک گئی ہے اور وہ اب کشمیر کی تحریک حریت کی وکالت ترک کر کے بھارت کے موقف کی وکالت پر اتر آئی ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کہتے ہیں:

آج کشمیر ثانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اب بنگلہ دیش اور کشن گنگا ڈیم کے مسائل اہم ہو گئے ہیں۔ صحافیوں، اداکاروں، گلوکاروں اور عوامی فنون کی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ پاکستان اور بھارت باہم شیر و شکر ہو رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے باوجود ہو رہا ہے کہ کشمیر پر بھارت کا قبضہ برقرار ہے اور یہاں ظلم و ستم کا بازار اسی

طرح گرم ہے، بلکہ فوجی مظالم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔
 جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم زنجیر غلامی کو کاٹنے کے لیے اپنا کام کرتے رہیں گے،
 بے وفائی کرنے والوں کی اپنی منزل تاریک ہے۔
 اللہ تعالیٰ سید علی شاہ گیلانی کی حفاظت فرمائے کہ وہ تاریکیوں میں ایک روشن چراغ اور
 ہمت ہارنے والی قیادت کے مقابلے میں ایمان، عزم اور منزل کے لئے جدوجہد کے باب میں
 استقامت کا ہمالہ ہیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
 وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

۵۵۱ شکست خوردگی

جنرل پرویز مشرف اپنی خطرناک قلابازی (u-turn) کے باوجود قوم سے یہی کہہ
 رہے ہیں کہ ان پر بھروسا کیا جائے، وہ کشمیر کے کار سے کبھی بے وفائی (betray) نہیں کریں
 گے۔ قوم ان کے اس اعلان پر کیسے بھروسا کر سکتی ہے؟ قوم یہ دیکھ رہی ہے کہ تین سال سے کشمیر
 کے مسئلے پر وہ مسلسل پسپائی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں اور اس طرح وہ قول و قرار کے
 معاملے میں سخت ناقابل اعتبار ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں ایوب، یحییٰ اور ضیاء
 کی طرح نہیں ہوں کہ اپنے اقتدار کو دوام دینے کی کوشش کروں لیکن عملاً انھوں نے ایوب اور
 ضیاء ہی کے نقش قدم پر چلنا پسند کیا، ریفرنڈم کا ڈھونگ بھی رچایا اور جس طرح ضیاء الحق نے ۹۰
 دن کا وعدہ کر کے وعدہ خلافی کی، اسی طرح جنرل پرویز مشرف نے بھی دسمبر ۲۰۰۴ء میں وردی
 اتارنے کا عہد و پیمانہ کر کے عہد شکنی کی۔ دستور کی حفاظت کا حلف لے کر دستور کو پامال کیا،
 سیاست میں فوج کی عدم مداخلت کا عہد کر کے فوج کو سیاست میں ملوث کیا اور اب اسے بدستور
 ملوث رکھنے پر مصر ہیں۔ اس ریکارڈ کی موجودگی میں ان کے عہد و پیمانہ پر کون بھروسا کر سکتا
 ہے۔ اور ان کے الفاظ اور حقیقت کے فرق کو کون نظر انداز کر سکتا ہے کہ موصوف نے کونسل میں
 اسٹاف کالج میں خطاب کرتے ہوئے، یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ملک میں جمہوریت قائم ہے، نظام

حکومت وزیراعظم چلا رہے ہیں اور فوج کا سیاست میں کوئی دخل نہیں! کیا دن کورات اور رات کو دن کہنے اور چوری اور سینہ زوری کی اس سے تابناک مثال بھی مل سکتی ہے؟

پھر وہ کہتے ہیں کہ میں کسی کے دباؤ میں فیصلے نہیں کرتا حالانکہ جس طرح امریکا کے دباؤ میں وہ ۲۰۰۱ء سے مسلسل اقدامات کر رہے ہیں اور اب بھارت سے دوستی کی پیٹنگیں بڑھا رہے ہیں (واضح رہے کہ ۶ جنوری ۲۰۰۱ء کے پاک بھارت اعلامیے کے بارے میں امریکا کے سابق وزیر خارجہ کولن پاول کا یہ اعلان اب ریکارڈ کا حصہ ہے کہ اس کا مسودہ ان کا تیار کردہ تھا (ملاحظہ ہو ڈان ۱۱ مئی ۲۰۰۵ء کے شمارے میں سابق خارجہ سیکرٹری شمشاد احمد کا مضمون CBMs: not a final solution) وہ بالکل واضح ہے۔ اور باب ووڈ ووڈ کی کتاب *Bush at War* میں پاکستان کے جنرل پرویز مشرف کے ذلت آمیز طریقے سے ہتھیار ڈالنے (abject surrender) کی جو تفصیلات ملتی ہیں اس کی روشنی میں کون اس بات پر یقین کرے گا کہ جنرل پرویز مشرف کے بنیادی فیصلے واشنگٹن میں نہیں، اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ خود ان کے وزیر کہتے ہیں کہ اگر ہم نے بٹش کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو ہمارا حشر بھی افغانستان اور عراق جیسا ہوتا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ یہاں فیصلے بیرونی دباؤ کے تحت ہو رہے ہیں یا ملکی حاکمیت اور قومی وقار اور مفادات کے مطابق۔

جنرل صاحب بار بار یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ دنیا کے حالات بدل گئے ہیں، اور نائن لیون کے بعد اب قوت کے استعمال سے سیاسی فیصلے نہیں ہو سکتے، حالانکہ نائن لیون کا اگر کوئی سبق ہے تو صرف یہ کہ اس کے بعد صرف قوت ہی کے ذریعے فیصلے ہو رہے ہیں۔ جو کمزور ہے یا قوت کا استعمال کرنے کا عزم اور داعیہ نہیں رکھتا، اس کے مقدر میں محکومی کے سوا کچھ نہیں۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قوت کا جواب قوت ہی سے دیا جاسکتا ہے اور امریکا اپنی ساری عسکری اور ٹکنالوجیکل برتری کے باوجود نہ پورے افغانستان پر اپنا اقتدار مسلط کرنے میں کامیاب ہے اور نہ عراق پر بلکہ پوری دنیا نائن لیون کے بعد پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ دہشت گردی کو دہشت گردی سے ختم کرنے کی حکمت عملی یکسر ناکام ہو گئی ہے، نیز دہشت گردی کے اسباب دور کرنے کے بارے میں زبانی جمع خرچ کے باوجود اس سمت میں کوئی مؤثر اقدام دنیا میں کسی جگہ بھی (بشمول فلسطین، کشمیر، شیشان، فلپائن، تھائی لینڈ) نہیں کیا گیا۔ بد قسمتی سے کشمیر

میں امریکا اور بھارت کے دباؤ میں جنرل پرویز مشرف نے تو تحریک آزادی سے براءت کا اعلان کر دیا ہے اور اسے دہشت گردی کے خانے میں رکھ دیا ہے لیکن بھارت کی ریاستی دہشت گردی اسی طرح جاری ہے بلکہ روز افزوں ہے۔ دوسری طرف حق خود ارادیت ہی سے دست برداری کا راستہ اختیار کر کے ”زیادہ سے زیادہ خود مختاری“ علاقائی تقسیم اور کھلی سرحدوں کی باتیں ہو رہی ہیں جو تنازع کے اسباب دُور کرنے کے بجائے ان کو دائمی شکل دینے اور نہ ختم ہونے والی پنچہ آزمائی کا سامان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

سیدھی اور واضح بات یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف ذہنی شکست قبول کر چکے ہیں اور اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کے لیے سیاسی ملج آرائی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سیاسی، معاشی اور عسکری قوت میں عدم مساوات کوئی نئی بات نہیں اور دنیا میں سیاسی نقشے اس عدم مساوات کے باوجود بدلے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ کیا آج افغانستان میں امریکی افواج اور نہتے عوام کے درمیان قوت کی مساوات ہے؟ کیا عراق میں یہ مساوات ہے؟ کیا دنیا کے ۱۴۰ ممالک جو گذشتہ ۵۰ سال میں عظیم اور طاقت ور استعماری قوتوں کے چنگل سے جنگ آزادی لڑ کر آزاد ہوئے ہیں عسکری مساوات کے ساتھ جدوجہد کر رہے تھے؟ کیا بھارت کو ۱۹۸۹ء کے بعد کشمیر میں جس مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ عسکری مساوات پر مبنی ہے؟ آج بھی جس جہادی تحریک سے بھارت پریشان ہے اور تمللا رہا ہے اس کے بارے میں اس کے اپنے چیف آف اسٹاف کا قول ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۱۰ ہزار مجاہد (جنہیں وہ دہشت گرد کہتا ہے) میدان میں ہیں اور بھارت کی ۹ لاکھ فوج ان کو قابو نہیں کر پارہی ہے۔ بات مساوات کی نہیں، اصل مسئلہ ایمان، عزائم اور اپنے اہداف کے حصول کے لیے استقلال اور پامردی کا ہے۔ کارگل کے معرکے میں بھی اصل فاتح بھارتی فوج نہیں وہ شہید کرنل ہے جس نے تنہا بھارتی فوج کو خون کے آنسو رلا دیے اور جس کی شجاعت اور استقامت پر بھارتی فوج نے بھی رشک کیا!

پاکستان کوئی کاغذی مملکت (banana republic) نہیں۔ یہ ریاست الحمد للہ ایک نیوکلیئر پاور اور ایک عظیم قوم کی روایات کی امین ہے جو اپنے ایمان، عزت اور آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے باب میں شاعرانہ ریکارڈ رکھتی ہے۔ پاکستانی قوم نے گذشتہ ۵۷

برسوں میں اپنا پیٹ کاٹ کر فوج کو جو وسائل فراہم کیے ہیں اور جسے آپ خود ناقابلِ تسخیر دفاعی قوت کہتے ہیں وہ کس لیے ہے۔ کیا بین الاقوامی تعلقات کا یہ ایک مسلمہ اصول نہیں کہ جنگ خارجہ پالیسی کا ایک آلہ ہے (war is an instrument of foreign policy)۔ اگر جنگ امریکا، برطانیہ، روس، اسرائیل، بھارت کے لیے خارجہ سیاست کا ایک آلہ کار ہے تو دوسروں کے لیے کیوں ممنوع ہے۔ بلاشبہ جنگ نہ مطلوب ہے اور نہ محمود لیکن اگر ضرورت پڑے تو آزادی اور حاکمیت کی حفاظت کے لیے یہی مؤثر ترین راستہ ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اور پہلے سے اس دروازے کو بند کر دینا دراصل اپنی آزادی اور حاکمیت کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے۔ یہ مذہب گو سفنداں تو ہو سکتا ہے اسے کیش مرداں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر ایک دعویٰ یہ بھی کیا جا رہا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے لیے بس یہ نادر موقع ہے جسے اگر ہم نے گرفت میں نہ لیا تو ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سے زیادہ ناسازگار وقت اس مسئلے کے حتمی حل کے لیے کبھی نہ تھا۔ اس وقت تو ضرورت اس کی ہے کہ تحریک آزادی کی حفاظت کی جائے، مناسب تیاری — عسکری اور معاشی اور سب سے بڑھ کر ملک میں قومی مفاہمت اور یک رنگی — جاری رکھی جائے اور صحیح وقت کا انتظار کیا جائے۔ بھارت کے لیے قبضے کی قیمت (cost of occupation) کو جتنا بڑھایا جاسکتا ہو بڑھایا جائے، لیکن پورے تحمل اور حکمت و تدبیر کے ساتھ۔ یہ وقت دوستی کی پیشگی بڑھانے کا نہیں، مسئلے کو زندہ رکھتے ہوئے رکھ رکھاؤ کے ساتھ مناسب وقت کے انتظار کا ہے۔ نیز ہر اس اقدام سے مکمل اجتناب کیا جائے جو جموں و کشمیر کے عوام اور ان کی قومی تحریک مزاحمت کو کمزور کرنے والی یا ان کی توقعات پر اوس ڈالنے والی ہو۔ اور یہی رائے ان تمام افراد کی ہے جن کی نگاہ دنیا کے حالات، پاکستان کے لیے کشمیر کی اہمیت اور بھارت کے اپنے حالات پر ہے۔ جنرل صاحب کی یہ بے قراری کہ ان کے عہد حکومت اور من موہن سنگھ کے عہد حکومت میں مسئلے کا آخری حل نکل آئے، خود غرضی اور بے بصیرتی کے سوا کچھ نہیں۔ پاکستان کی خارجہ سیاست کے تمام اہم کردار متنبہ کر رہے ہیں کہ یہ وقت جلد بازی میں کوئی اقدام کرنے کا نہیں ہے۔

تجربہ کار سفارت کاروں کا اضطراب

آغا شاہی اور حمید گل تو بار بار کہہ چکے ہیں لیکن اب تو وہ لوگ بھی بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں جو خاموش سفارت کاری سے آگے کبھی نہ بڑھتے تھے۔ مثلاً:

سابق خارجہ سیکرٹری شمشاد احمد جو کارگل کے وقت بھی اس عہدے پر فائز تھے ڈان میں اپنے مضمون: CBMs: Not a Final Solution (۱۱ مئی ۲۰۰۵ء) میں متنبہ کرتے ہیں کہ یہ وقت فیصلے کا نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ہر صورت میں دونوں ملکوں کے تعلقات کی اشتعال انگیز تاریخ اور ماضی کے تجربات کے پیش نظر غیر حقیقی امیدیں قائم کرنے یا نتائج نکالنے میں محتاط ہونا چاہیے۔ دونوں طرف بد اعتمادی اور اندیشوں کی گہری جڑیں ہیں اور محض شعلوں پر پھونکیں مارنے یا نیک خواہشات کرنے سے یہ تحلیل نہ ہو جائیں گے۔ بھارت اور پاکستان دونوں کو اس کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے گہرائی میں جانا ہوگا۔

اعتماد سازی کے اقدامات بہتر ماحول پیدا کرنے کے لحاظ سے اس عمل میں معاون ہو سکتے ہیں لیکن یہ تنازعات حل کرنے کا متبادل نہیں ہیں۔ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ لچک کی ایک طرفہ پیش کشوں کے باوجود صدر مشرف متنبہ کرتے رہے ہیں کہ جب تک کہ میں پوشیدہ مسائل حل نہ پیش کیے جائیں گے، تنازعات پھر بھڑک اٹھیں گے۔ جو کام پیش نظر ہے وہ آسان نہیں ہے۔ متعلقہ مسائل کی پیچیدگی کے بارے میں کوئی فریب نظر نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں ان کی مزید ضرورت ہے اور اسے برقرار رکھنا چاہیے لیکن جلد بازی میں ایسے فیصلوں کی طرف نہیں جانا چاہیے جو دونوں ممالک میں داخلی طور پر حکومت یا شخصیات کی تبدیلی کے بعد برقرار نہ رہ سکیں۔

ہمیں ضرورت ہے کہ پاکستان میں بھارت کے لیے اپنی تبدیل شدہ پالیسی کے بارے میں قومی اتفاق رائے پیدا کریں۔ اس کے لیے شفافیت اور داخلی محاذ پر حقیقی قومی کوشش کے ذریعے اعتماد سازی کی ضرورت ہوگی، بحث اور اتفاق کے لیے ہوٹلوں کی لابیوں میں نہیں بلکہ پارلیمنٹری چیمبرز میں تمام متعلقہ سیاسی عناصر کے

اشتراک کے ساتھ۔

ایک سابق سفیر جاوید حسن ڈان (۱۸ مئی ۲۰۰۵ء) میں Kashmir: The Time Factor کے عنوان سے اپنے مضمون میں حالات کی سنگینی پر قوم اور قیادت کو متنبہ کرتے ہیں اور صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ وقت آخری حل کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں ہے۔ اس وقت بہترین حکمت عملی اس مسئلے پر holding on operation (برقرار رکھنے کا عمل) ہے نیز آخری فیصلے کے لیے تیاری کی جائے جو ان کے خیال میں اگلے ۲۵ سال میں ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اگر ہم ربع صدی کے اس طویل وقفے کے بعد بھارت کے مقابلے میں مضبوط پوزیشن میں ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں داخلی سیاسی استحکام کو مضبوط کرنا چاہیے۔ قومی سطح پر ایک منظور شدہ سیاسی فریم ورک کے اندر جس میں نمائندہ اداروں کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے، افراد پر انحصار کے بجائے ادارے تعمیر کیے جائیں، قانون کی حکمرانی کو مضبوط بنایا جائے اور میرٹ پر فیصلے کرنے کے اصول پر عمل کیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں ملک کی معاشی ترقی میں اضافہ کرنا چاہیے۔ اس کے لیے قومی وسائل کا زیادہ بڑا حصہ معاشی ترقی کے لیے مختص کر کے تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنی معاشی منصوبہ بندی میں زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ اس کا تقاضا ہوگا کہ ہم اپنے دفاعی اخراجات پر سخت کنٹرول کریں اور ممکنہ کم ترین قیمت پر قابل لحاظ سہہ جارحیت برقرار رکھیں۔

کشمیر کے تنازعے کے عاجلانہ آخری حل کی توقع یا تو موجودہ حقائق کے بارے میں شدید غلط فہمی پر مبنی ہے یا اس مفروضے پر مبنی ہے کہ پاکستان کا مستقبل اس کے ماضی سے بہتر نہیں ہوگا۔ یہ مفروضہ اتنا مایوس کن اور شکست خوردہ ہے کہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا گذشتہ ایک دو سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ بھارت کشمیر کے آخری حل کے لیے ہماری بے صبری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم سے ایک طرفہ رعایتیں حاصل کرے گا۔

سابق سفیر اور خارجہ سیکرٹری اقبال اخوند اپنے مضمون Kashmir: denouement

or sell out (ڈان ۲۹ اپریل ۲۰۰۵ء) میں اپنے شدید اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے متنبہ کرتے ہیں کہ جلدی میں کوئی اقدام نہ کریں۔ وہ لکھتے ہیں:

کشمیر کے تنازعے کا معاملہ تو ایک طرف رہا، مشرف من موہن سنگھ معاہدہ ایسا ہے جو سیاچن یا بگلہار یا تنازعے کے دوسرے ضمنی مسائل تک کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ یہ سری نگر مظفر آباد بس سروس ٹرکوں کے ذریعے تجارت کے اضافے اور منقسم ریاست کے دوسرے علاقوں اور شہروں کے درمیان بھی ایسی ہی سروس کے اجرا کی تجویز دیتا ہے۔ کیا لائن آف کنٹرول کی یہ نرمی (ایک طرح کا جواز فراہم نہ بھی کرے تب بھی) عملاً اس کو استحکام دینے کے مصداق نہیں ہے؟

اس طرح ہمارے آپشن کم ہو جاتے ہیں (اور کافی عرصے سے کم ہیں) کہ اپنی پوزیشن پر کھڑے رہیں یا میدان جیسا بھی ہے اس میں کھیلیں۔ لیکن جب کوئی کشمیر پر ہمارے اصولی موقف پر قائم رہنے کی بات کرتا ہے تو اس کے ٹھیک ٹھیک کیا معنی ہوتے ہیں؟ مسئلہ کشمیر کا اساسی غیر متبدل اصول (صرف اس لیے نہیں کہ یہ اقوام متحدہ کی قراردادوں میں لکھا ہوا ہے) حق خود ارادیت کا اصول ہے اور یہ کشمیری عوام کو نظر انداز کر کے کنٹرول لائن پر سمجھوتے کو خارج از بحث قرار دیتا ہے۔ شروع ہی سے بھارت اس بات کے حق میں رہا ہے کہ ”جس کو ملے وہی پائے“ کے اصول پر تقسیم کر لی جائے لیکن اب اس ملک میں کچھ امن کے حامی ایسے ہیں جو آگے جانے کے لیے تیار ہیں۔ یقیناً پاکستان کے پاس کشمیر پر بھارت کے قبضے کو قبول کرنے اور جائز قرار دینے کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز نہیں ہے اور نہ کوئی عملی سیاسی دلیل ہے کہ وہ اپنا حصہ رکھنے کے تبادلے میں ایسا کرے۔

بلاشبہ معاہدہ دہلی پر خاصا شور شرابا ہے مگر یہ ماحول دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی اہمیت کے بغیر نہیں ہے جہاں کے عوام جذباتی ہنگامہ آرائی کی لہروں کے ساتھ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف بہہ جانے کے عادی ہیں۔ کشمیر میں بس سروس اور تجارتی راستے کھولنے سے کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ ایسا آغاز ہیں جن کے حتمی نتیجے کی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ منقسم کشمیریوں کا باہم ملنا جلنا خود

اپنی ایک حرکیات پیدا کر سکتا ہے۔ بھارت کو بھی زمینی حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا اور اس کے مضمرات کو تسلیم کرنا ہوگا۔ بھارت کا کشمیر کو ۵۰ برس سے اپنا اٹوٹ انگ کہنے نے اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا ہے کہ بھارت کا کشمیر پر قبضہ ہمیشہ کی طرح غیر یقینی رہے گا۔

کسی بھی صورت میں کشمیر پر پیش رفت خط مستقیم پر نہیں ہوگی۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے بھارت سے مذاکرات میں پاکستان کسی ہموار میدان میں نہیں کھیل رہا۔

سفارتی میدان میں آپ کا کھیل کرکٹ نہیں ہوتا۔ آپ اس پر انحصار نہیں کر سکتے کہ کوئی انضمام نامی سفارت کار آخری گیند پر چوکا لگائے اور ثرائی جیت لائے۔

قائد اعظم یونیورسٹی کے سابق ڈین پروفیسر اعجاز حسین کی بات بھی ریکارڈ پر لانے اور اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے، وہ لکھتے ہیں:

مشترکہ اعلامیے میں جنگ بندی پر کوئی دفعہ نہیں ہے، وادی سے بھارتی افواج کو واپس بلانے پر کوئی وعدہ نہیں ہے اور بھارتی سکیورٹی فورسز کے ریاستی دہشت گردی کے اقدامات کو روکنے کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس میں سیاچن سرکریک یا بگلہار پر کسی پیش قدمی کا کوئی بیان نہیں ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اُمیدوں سے بھی زیادہ کامیابی کے وعدے حیران کن ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے جو مبالغہ آمیز دعویٰ کیا ہے اس کی کیا بنیاد ہے؟ انھوں نے اسے کشمیر کے تنازعے کو حل کرنے کی تلاش میں بھارتی قیادت کے خلوص کے حوالے سے بیان کیا۔ واہ، کیا سادگی ہے!

مشترکہ بیان کے مطابق امن کا عمل ناقابل واپسی ہے۔ یہ مشرف کے اس سابقہ دعوے سے بہت نیچے اترنا ہے کہ کشمیر کے تنازعے کو حل کرنے میں ناکامی امن کے عمل کو روک دے گا۔ اس پسپائی کے بعد ایک اور پسپائی آئی۔ صدر نے اپنی سابقہ پوزیشن کی جو گذشتہ سال کئی موقعوں پر بیان کی تھی کہ کشمیر کا تنازع حل کرنے کے لیے ایک حتمی تاریخ کا تعین کیا جائے، خود ہی تردید کر دی۔ ان قلابازیوں پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ان کی بھارت پر عنایات کا تسلسل ہے۔ بشمول اقوام متحدہ کی قراردادوں

سے دستبرداری کشمیر کے حل کے لیے نارملائزیشن کی اہمیت اور کشمیر میں روا مسلح جدوجہد کو دہشت گردی قرار دینا۔ کہا جاسکتا ہے کہ امن کے عمل کو ناقابل واپسی قرار دے کر کشمیر پر یوٹرن کو مکمل کر لیا گیا۔

پس کشمیر کی پالیسی جس پر صدر عمل پیرا ہیں اور جس کی مغرب اور بھارت حمایت کر رہے ہیں، امن کے عمل کی کامیابی کے لیے خوش آئند نہیں۔ کشمیر پر کوئی امن دیر پا ہونا ممکن نہیں ہے جو کشمیر پر قومی اتفاق راے کی مضبوط بنیادوں پر نہ ہو۔ صدر کو یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر پاکستان کی کئی حکومتوں کا قبرستان بن چکا ہے۔

فیصلے کی گھری

یہ ہے پاکستانی تجربہ کار سفارت کاروں اور دانش وروں کی سوچ جو قوم کی اجتماعی سوچ کی نمائندگی کرتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف اسے یکسر نظر انداز کر کے جس ایجنڈے پر بگٹٹ رواں دواں ہیں وہ صرف ہزیمت اور تباہی کا راستہ ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ان کو اس میں مزید پیش قدمی سے روکا جائے اور قوم اپنے تشخص، آزادی، اسٹریٹجک مفادات اور اپنے ڈیڑھ کروڑ کشمیری بھائیوں اور بہنوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو۔ جس مشکل مقام پر جنرل صاحب نے ہمیں پہنچا دیا ہے اس کی بڑی وجہ ملک میں فرد واحد کا اقتدار اور قومی اداروں کے ذریعے اور قوم کو اعتماد میں لے کر قومی امور پر فیصلے نہ کرنے کا رجحان ہے جو ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ یہی جمہوریت اور آمریت کا بنیادی فرق ہے۔ جمہوریت میں اگر ایک طرف دستور کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور قومی احتساب اور جواب دہی کا نظام موثر ہوتا ہے تو دوسری طرف فیصلہ سازی کے لیے اداروں پر انحصار کیا جاتا ہے اور بحث و مشاورت کے نتیجے میں قومی امور پر فیصلہ قومی اتفاق راے سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود کشمیر پالیسی کے صحیح خطوط پر مرتب ہونے اور چلائے جانے کا انحصار جمہوریت کی مکمل بحالی اور پارلیمنٹ کی بالادستی میں ہے۔ جنرل صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اس میں نہ انھوں نے کابینہ کو اعتماد میں لیا ہے اور نہ پارلیمنٹ کو، حتیٰ کہ پارلیمنٹ کی کشمیر کمیٹی تک کو کسی معاملے میں شریک مشورہ نہیں کیا گیا۔ بس ایک شخص حالات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پالیسی سے انحراف کر رہا ہے جس پر پوری قوم کا

اتفاق رہا ہے اور جو خود دستور میں مرتب ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ایک بار پھر قوم کے تمام ذمہ دار عناصر پاکستان کی اصولی پالیسی کا اعادہ کریں اور قوم کو بیدار کریں تاکہ انحراف کرنے والے ہر قدم کو روک دیا جائے اور تحریک آزادی کشمیر کے شہیدوں کے خون سے بے وفائی نہ کرنے دی جائے، خواہ اس کے لیے جدوجہد کتنی ہی طویل اور صبر آزما کیوں نہ ہو۔

سب کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مسئلہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی سرحدی تنازع نہیں جیسا کہ چین اور بھارت کے درمیان ہے۔ ہمارے سامنے اصل ایشو ریاست جموں و کشمیر کے حق خود ارادیت کا ہے جس کی پشت پر انصاف کے مسلمہ اصول، بین الاقوامی قانون، اقوام متحدہ کی قراردادیں اور جمہوریت کی متفق علیہ روایات ہیں اور جن کا تقاضا ہے کہ ریاست کے ڈیڑھ کروڑ انسان اپنی آزاد مرضی سے اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کریں۔ یہی وہ حق ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ جغرافیہ، تاریخ، عقیدہ، ثقافت، معیشت ہر اعتبار سے ان کی تقدیر پاکستان سے وابستہ ہے اور انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اس کا اظہار بھی کر دیا ہے خواہ اس کا تعلق گھڑی کے وقت سے ہو یا قومی ترانے سے، کھیل سے ہو یا سیاست سے، تہواروں سے ہو یا رسوم و رواج سے — ان کے قومی ہیرو پاکستان کے اکابر ہیں، بھارت کے نہیں — لیکن اس حقیقت کے باوجود پاکستان اور خود اہل کشمیر کا موقف یہ ہے کہ ان کو اپنی رائے کے اظہار اور اپنے مستقبل کو طے کرنے کا باقاعدہ موقع ملنا چاہیے۔

پاکستان ان کے اس حق کا وکیل ہی نہیں، اس پورے معاملے میں ایک بنیادی فریق ہے۔ گو جھگڑا زمین کا نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس طرح زمین کا مسئلہ بھی ریاست کے باسیوں کے مسکن ہونے کی حیثیت سے متعلق ہے کہ مکین اور مکان لاینفک ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ اصل ایشو بھارت کے ناجائز قبضے سے نجات اور اہل کشمیر کا اپنی آزاد مرضی سے تقسیم ہند کی اسکیم کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا ہے، زمین کی بندر بانٹ اصل ایشو نہیں۔

پھر یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ کشمیر کے لوگ آسانیاں مانگ رہے ہیں۔ وہ تو اپنی آزادی اور شناخت کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور روزانہ شہادتیں پیش کر کے اور ہر شہید کی نماز جنازہ میں ہزاروں افراد کی صورت میں خراج تحسین پیش کر کے، اپنے عزم

اور مستقبل پر اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں۔ مسئلہ ریلیف نہیں بھارت کے تسلط سے آزادی ہے۔ پاک بھارت دوستی کی کوئی بھی کوشش اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب وہ عزت اور برابری کے مقام سے ہو اور وہ اسی وقت بار آور ہو سکتی ہے جب اس کا ہدف بنیادی تنازع کے حق و انصاف کے مطابق طے کیا جانا ہو جو تمام بگاڑ اور تصادم کا باعث رہا ہے۔ جو کچھ اس وقت کیا جا رہا ہے وہ سراب ہے اور دھوکا۔ اس سے کبھی بھی حقیقی دوستی جنم نہیں لے سکتی اور نہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ہم یہ کہنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ حق و انصاف سے ہٹ کر جو بھی عارضی حل تلاش کیا جائے گا وہ مزید تصادم اور تفرق کو جنم دے گا۔ پاکستانی قوم کسی ایسے انتظام کو کبھی قبول نہیں کرے گی جو کشمیری عوام کی تحریک آزادی سے بے وفائی پر مبنی ہو اور محض وقتی مفادات کے حصول کو سب کچھ سمجھ کر کیا گیا ہو۔ نیز کشمیری عوام بھی اپنی جدوجہد کو بے ثمر ہوتا نہیں دیکھ سکتے اور نہ وہ اپنے شہیدوں کے لہو سے غداری کے لیے تیار ہیں۔ ان کی جدوجہد بہر حال جاری رہے گی۔ اس لیے پاکستانی حکمرانوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ سراب کی تلاش میں وقت ضائع نہ کریں اور اصل حقائق کی روشنی میں مسائل کے حل کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ سب سے زیادہ اپنی قومی یک جہتی کی فکر کریں اور وسائل کے صحیح استعمال کے ذریعے وہ قوت حاصل کریں جس کے بغیر ہم نہ اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے مظلوم بھائیوں کے لیے حق و انصاف کے حصول کو ممکن بنا سکتے ہیں اس لیے کہ رع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

(ترجمان القرآن، جون ۲۰۰۵ء)